# حرف آخر

جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ علمائے برصغیر کے مذہبی اور سیاسی افکار کا مفصل تذکرہ ایک دوسری کتاب میں آئے گا۔ ہم نے یہاں دینی مدارس اور دارالعلوم کے نصاب کی بعض فنی خامیوں کو بیان کرنے کے لیے مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمود حسنؒ کی تحریروں پر اجمالی تبصرہ کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس نصاب کو وقت کے عملی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے نصاب، تعلیمی مقاصد، فقہی مزاج اور ارباب دیوبند کی مذہبی اور اخلاقی سیرتوں کا مختصر جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا صحیح ہو گا کہ دارالعلوم نے برصغیر میں مسلم جماعت کی بیمار مذہبی اور اخلاقی زندگی کو صحت مند بنانے اور مسلمانوں کی معنوی زندگی کو مکمل شکست و ریخت سے بچانے کے لیے ایک مثبت کردار ادا کیا ہے۔ آج نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا کے علمی حلقوں میں اس امر پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ جدید تعلیم کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے پاس تسکین روح کے لیے کچھ نہیں، بے شبہ اس نے خالص تحقیق اور تمدن کو آگے بڑھانے اور راحت جسم کے لیے بہت کچھ کیا ہے، لیکن اس تمدن کی رگوں میں دوڑنے والا خون انسانی روح نے فراہم کیا ہے اور وقت نے بتایا ہے کہ یہ سودا انسان کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہے دارالعلوم نے برطانوی ہندوستان میں تعلیم کا بنیادی مقصد "سطحی روشن

خیالی' کی بجائے جس کا ورد ارباب تجدد صبح و شام کر رہے تھے' انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانا قرار دیا' دارالعلوم تاریخ کے اس فیصلہ سے پوری طرح آگاہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بلند سیرت اور اخلاق فاضلہ کی طاقت ہی سے انسان اور معاشرے کی خدمت کر سکتا ہے۔ آج وقت نے تیمور اور غوری کی "فاتحانہ عظمت" کے ایک ایک نشان کو مٹا دیا ہے' لیکن شیخ معین الدین چشتیؒ نے راجپوتانہ کی ایک کٹیا میں بیٹھ کر اپنے آتشیں نفس سے انسانی روح میں محبت و اخوت اور امید و اعتماد کے جو چراغ جلائے تھے' وہ آج بھی روشن ہیں اور تاریکیوں میں حیران روحوں کو منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ شہاب الدین غوری کی فاتحانہ تلوار کسی ایک متنفس کے دل کو بھی صداقت اسلام کے اعتراف کے لیے نہیں جھکا سکی' مگر اس بادشاہ کا معاصر فقیر بے نوا جن کو ہم خواجہ غریب نواز کہتے ہیں جو شہاب الدین کی فتح کردہ دہلی میں نہیں' بلکہ پرتھوی راج کی ہندو راج دھانی میں غوری سے تقریباً" بیس سال پہلے آ چکا تھا' وہ بغیر کسی فوجی طمطراق کے فقیرانہ شان میں دہلی سے روانہ ہو کر اجمیر پہنچا ہے۔"(۱)

واقعہ یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اس مثال میں دراصل دارالعلوم کے پیغام کی تشریح کی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ارباب دیوبند کے ہاں مذہب دراصل تنگ نظری' تشدد یا فرقہ واریت سے عبارت نہیں' بلکہ مذہب ان کی بولی میں حق پرستی' خدا ترسی' سچائی' اخلاقی پاکیزگی اور خدمت خلق کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم نے اپنی مذہبی تعلیم کے ذریعہ معاشرے میں اخلاقی قدروں کی اشاعت کی اور اجتماعی فکر میں توازن' اعتدال اور صبرو تحمل کا درس دیا۔ ۱۹۲۴ء میں جب ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کیا تو اس کے بعض انتہا

پسند ساتھیوں نے پرانے تاریخی مقابر کو منہدم کرنا چاہا' جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو بڑا دکھ ہوا اور پورے ملک میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا' جس کو فرو کرنے کے لیے ہندوستانی علماء کا ایک وفد ابن سعود سے ملا' اس وفد نے ابن سعود سے کہا کہ ہم قبروں پر چراغ جلانے یا غلاف چڑھانے کو بدعت تصور کرتے ہیں' لیکن اہل بدعت کو بت پرست قرار نہیں دیتے۔ پختہ قبروں کا بنانا ایک مسئلہ ہے جو اس وقت زیر بحث نہیں' لیکن اکابر کی پختہ قبروں کا انہدام ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ جس سے مسلمانوں کے قلوب قلق و اضطراب کا شکار ہیں۔ اس وفد کے ایک رکن مولانا شبیر احمد عثمانی نے ابن سعود سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہماری غرض یہ ہے کہ آپ حقائق پر غور کریں' ہم لڑنے نہیں آئے' لیکن بات صاف کرنے آئے ہیں' آپ تعجیل نہ کریں اور ایسا کام کریں جو دلوں کو مطمئن کر دے' آپ حکمت سے کام لیں۔"(۲)

مولانا کی یہ تقریر ابن سعود کے دل میں اتر گئی' وہ حقائق سے آگاہ ہوا اور اسے پتہ چلا کہ دین میں جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے اور دین کا غلط تصور فتنوں کو جنم دیتا ہے' چنانچہ ہندوستانی علماء کا باوقار اور معتدل رویہ کامیاب رہا۔

قدیم علمائے دیوبند نے جہاں مسلمانوں کے درمیان مذہب کے نام پر فرقہ واریت کو پھیلانا جرم شمار کیا'(۳) وہاں انہوں نے غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ خوشگوار تعلقات کو استوار کرنا بھی ضروری قرار دیا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۹ء میں علمائے دیوبند نے "جمعیت علمائے ہند" کے نام سے اپنی جماعت قائم کی تو اس کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا: "غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ بہ مقتضائے فطرت و اتباع احکام شریعت ہمدردی و اتفاق کو ترقی دینا۔"(۴)

مذہب سے روشنی حاصل کرتے ہوئے غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ حسن عمل سے پیش آنا اور دنیاوی مسائل کے حل کے لیے باہمی تعاون سے کام لینا یقیناً ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تلقین اسلام نے کی ہے۔ اس اخلاقی فضیلت کا درجہ اس عمل صالح سے یقیناً بلند ہے' جسے وطنی اور سیاسی ضرورتوں نے جنم دیا ہے۔ مذہب کا یہ بلند تصور کہ "تمام بندے اللہ کا کنبہ ہیں" انسان کو مخلوط معاشروں میں امن و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا درس دیتا ہے اور خدمت خلق کو زندگی کی ایک بلند قدر شمار کرتا ہے' کہا جاتا ہے کہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے جو گزشتہ صدی کے ارباب صدق و صفا میں سے تھے' ریل گاڑی میں اپنے چند ہندو ہم سفر ساتھیوں کے کہنے پر لیٹنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ ایسا کرنے سے ان کے پاؤں کا رخ ان کے ہندو ساتھیوں کے چہروں کی طرف ہو رہا تھا اور یہ امر قاری صاحب کو گوارا نہیں تھا' ان کا کہنا تھا: "میرا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ کسی انسان کے چہرے کی بے ادبی کروں' ہم ہر شخص کے چہرے کا احترام کرتے ہیں۔"(۵) مذہب کا یہی لطیف تصور ہے جو دو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو امن و آشتی سے رہنے کا درس دیتا ہے' لیکن جب کبھی دنیاداروں اور کم ظرفوں نے مذہب کو اس کی بلندیوں سے نیچے اتارنے کی کوشش کی' تو ایک ہی مذہب کے ماننے والے دو آدمی بھائی بھائی بن کر ایک جگہ نہ بیٹھ سکے اور انسانی بستیاں ویران ہونے سے نہ بچ سکیں۔ چنانچہ ایک مخلوط معاشرے میں مذہبی رہنماؤں کا انتہائی حزم و احتیاط اور حکمت و بصیرت سے امن و آشتی کے قیام کے لیے کام کرنا اجتماعی زندگی کا مشکل ترین مسئلہ ہے' اس نازک اور پیچیدہ مسئلہ سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے علمائے دیوبند نے جس مذہبی بصیرت کا ثبوت دیا ہے' اس پر دارالعلوم بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دارالعلوم کی شائع کردہ ابتدائی سالانہ

رپورٹوں میں ارباب دیوبند نے ان ہندوؤں کا شکریہ ادا کیا ہے جو مدرسہ کی لائبریری کے لیے اپنی مطبوعات بھیجتے تھے۔ ایسے ہی قیام مدرسہ کے وقت مدرسہ کی ابتدائی کلاسوں میں ہندو بچے بھی پڑھتے تھے۔

دارالعلوم کی ایک اور قومی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر اردو زبان کی بھی خدمت کی ہے۔ اردو نہ صرف دارالعلوم میں تعلیم و تدریس اور باہمی افہام و تفہیم کی زبان بن کر مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں میں فکری وحدت کے رشتوں کو مضبوط کرتی رہی' بلکہ دارالعلوم ہی کے توسط سے افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی پہنچ گئی۔ نہیں معلوم! اردو زبان کی تاریخ نے اردو کے لیے دارالعلوم اور دوسرے دینی مدارس کی خدمات کا اعتراف کیا ہے یا نہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ علماء نے تعلیم و تدریس کے علاوہ اپنے روحانی حلقوں میں بھی تربیت و تزکیہ کے لیے اردو زبان ہی کو ذریعہ ابلاغ بنایا' جس سے نہ صرف اردو کا حلقہ وسیع ہو تا گیا' بلکہ اردو زبان کے سرمایہ فکر میں بھی اضافہ ہوا' سلوک و تصوف کے لطائف و معارف اردو زبان میں ڈھلنے لگے' جس سے اردو کے علمی سرمایہ میں اضافہ ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات اصحاب عمائم نے عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ و تراکیب کو اردو زبان پر ٹھونسنا چاہا جس سے اردو زبان کو نقصان پہنچایا اکثر علماء کی تحریروں میں وقت کے ذہنی و فکری رجحانات کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ لیکن ان ساری خامیوں کے باوجود یہ کہنا درست ہو گا کہ اردو زبان کو علمائے دیوبند کی مذہبی اور اخلاقی تحریروں سے فائدہ ہی پہنچا۔

دارالعلوم نے ایک دوسری ملی خدمت خواندگی کی شرح میں اضافہ کر کے سرانجام دی ہے۔ برطانوی ہندوستان میں' بالخصوص گزشتہ صدی میں' سرکاری مدارس کے دروازے عموماً" غریب بچوں پر بند تھے۔ دارالعلوم اور

معروف دینی مدارس نے نادار اور مفلس طالب علموں کے لیے مذہبی تعلیم کا مفت انتظام کر کے ان کی فکری اور اخلاقی تربیت کی' واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کا غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا موجب حیرت نہیں ہے' اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ امر باعث تعجب ہوتا کیوں کہ علمائے دیوبند کا تعلق عموماً" غریب طبقہ سے تھا' لیکن جب انہیں اپنی دینی اور روحانی خدمات کی وجہ سے معاشرہ میں ایک مقام حاصل ہوا۔ تو اس سے مسلمانوں کا اجتماعی فکر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور معاشرے پر سرکار پرست عناصر کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور پھر جب پہلی جنگ عظیم میں علماء سیاست کے میدان میں اترے' تو پرانی سیاست کے بت بھی ٹوٹنے لگے' ہمیں یہاں اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کہ ان بتوں کو توڑنے اور حکومت وقت کی ہیبت و قہرمانی کے طلسم کو پاش پاش کرنے میں اور عوامل بھی کار فرما تھے' ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں علماء کی آمد سے سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور اس نے حکومت سے اپنی وفاداری کے مضبوط رشتوں کو توڑ کر عوام سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ بے شبہ اجتماعی زندگی میں علامہ اقبال اور حسرت موہانی جیسے معروف اہل درد نے غریبوں کی معاشی خوش حالی کے لیے زور دار آوازیں اٹھائیں' مقدم الذکر نے تو پنجاب کونسل میں کسانوں کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہا: میری رائے میں ہندوستان میں اسلام کا مستقبل بڑی حد تک پنجاب کے کسانوں کو (معاشی) آزادی پر موقوف ہے۔"(٦) ١٩٣٧ء میں علامہ نے غریب مسلم عوام کی اقتصادی بہتری کے لیے جو صدیوں سے رہین ستمہائے روزگار تھے' بانی پاکستان سے خط و کتابت بھی کی' لیکن علامہ جیسے عبقری انسان (Genius) اور دوسری ممتاز روشن خیال اور بالغ نظر شخصیتوں کے علاوہ علمائے دیوبند کی سیاست پر روز اول ہی سے انگریز دشمنی اور مظلوم طبقوں سے ہمدردی کے جذبات کی گہری

چھاپ تھی' نہ صرف جمعیت علمائے ہند بلکہ اس کے زیر اثر جماعتوں' نے بھی ملک کے غریب عوام کی سیاسی سیادت کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ مثلاً احرار نے کھل کر یہ کہا:

"احرار کا وطن وہ سرزمین ہے جہاں
(۱) سوسائٹی میں درجے نہ ہوں' بلکہ انسانیت ایک درجہ ہو۔
(۲) جہاں--- لوگوں کو--- ان کی ضرورتوں کے مطابق معیشت مہیا ہو
(۳) جہاں ہر کوئی اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق ترقی کرنے میں آزاد ہو
(۴) جہاں نظام حکومت کامل مساوات پر قائم ہو۔"(۷)

احرار نے غریبوں کی حمایت میں مزید کہا:

"طبقاتی جنگ ہمارے مزاج کے عین مطابق ہے' اس سے غریبوں میں جان آتی ہے اور ان میں عزت نفس کا احساس بڑھتا ہے۔"(۸)

الغرض برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک مذہبی سیاسی جماعت کا محنت کشوں اور کسانوں کی حمایت میں آواز اٹھانا اور دولت کی منصفانہ تقسیم کو حکومت کے بنیادی فرائض میں شمار کرنا مسلم سیاست کی دنیا میں یقیناً ایک انقلابی قدم تھا' جس کا سہرا اس صدی میں دوسری ترقی پسند پارٹیوں کے ساتھ ساتھ اقبال' حسرت موہانی' احرار اور علمائے حق کے سر ہے۔

علمائے دیوبند کی علمی اور مذہبی سرگرمیوں نے جہاں مسلم جماعت کی مذہبی اور اخلاقی زندگی پر صحت مند اثرات چھوڑے' وہاں دارالعلوم کے تعلیمی پروگرام سے مسلمانوں کی صدیوں پرانی تعلیمی روایت کو نقصان بھی پہنچا' جیسا کہ ہم نے درس نظامی پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تعلیم دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی اور برطانوی ہندوستان میں پہلی بار دینی اور دنیاوی یا قدیم اور جدید تعلیم کی اصطلاح بولی جانے لگی' جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دو ممتاز تعلیمی

ادارے: دیوبند اور علی گڑھ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے' ارباب علی گڑھ' اہل دیوبند کو قدامت پسندی کا طعنہ دیتے اور ان کے طرز فکر اور طرز معاشرت کو ماضی کا ایک نشان گردانتے' دوسری طرف ارباب دیوبند علی گڑھ اور "روشن خیال گروہ" پر غلاموں کی خوش پوش جماعت' کی پھبتی کستے' قاری عبدالرحمان پانی پتی کالج کو مجھلے (جہالت کدہ) کے نام سے یاد کرتے' غرضیکہ دو علمی اداروں کی باہمی فکری آویزش سے مسلم جماعت بہ قول ڈاکٹر فضل الرحمان دو "قوموں" میں بٹ گئی' یہ حادثہ نہ صرف مسلم ہندوستان میں پیش آیا' بلکہ مصر اور ترکی جیسے مسلم ممالک کو بھی اس حادثہ سے دو چار ہونا پڑا' جس پر "اسلام اور جدیدیت" کے فاضل مصنف نے تفصیل سے عمدہ بحث کی ہے۔(۹) واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے فکر میں تنوع ہے' کہیں وہ انقلاب پسند واقع ہوا ہے اور کہیں سکون پسند' مثلاً اجتماعی اور سیاسی زندگی میں تو وہ حرکت کا قائل ہے' جس نے ارباب دیوبند کو آزادی وطن کے لیے انگریز دشمن تحریکوں کا ساتھی بنایا' لیکن یہی فکر مذہبی میدان میں سکون پسند واقع ہوا ہے اور وہ قرون وسطی مین علم کلام اور علم فقہ کی ابحاث سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا' جس کی وجہ سے اسے شعوری یا لاشعوری طور پر شریعت مقدسہ کی تفسیر و تاویل میں وقت کے تقاضوں کو نظرانداز کرنا پڑا ہے کیوں کہ اس کے نزدیک قرون وسطی کی فقیہانہ عقل و اجتہاد نے ہمارے مسائل کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور قاری محمد طیب صاحبؒ نے "اجتہاد و تقلید" سے متعلق اپنی تحریروں میں یہی موقف اختیار کیا ہے' ان کی رائے میں انسان قانون کے لیے ہے' قانون انسان کے لیے نہیں۔ نظام تعلیم کے بارے میں بھی دارالعلوم کی یہی رائے ہے' اگر دارالعلوم اپنے نصاب تعلیم کو وقت کی علمی ترقیوں سے ہم آہنگ کر لیتا اور عربی زبان' عربی ادب' علم کلام' فلسفہ وغیرہ سے متعلق قرون

وسطی کے تعلیمی نصاب کو تجربہ' مشاہدہ' کلاسیکی ادب اور علمی ارتقاء کی روشنی میں از سر نو مرتب کرتا' تو ہماری تعلیم قدیم اور جدید کی تقسیم سے بچ جاتی اور ہماری تعلیمی روایت کا تسلسل برقرار رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دعویٰ بہ ظاہر مضبوط نظر آتا ہے' لیکن واقع میں شاید ایسا نہیں ہے' کیوں کہ جس عہد مین ہمارے اسلاف نے یونانی افکار کو اپنایا تھا' اس وقت یونان اپنی سیاسی اہمیت کھو چکا تھا' لیکن مسلمان سیاسی دنیا میں ایک موثر کردار ادا کر رہے تھے' اس کے بر عکس جب عہد نو میں نئی تعلیم کا شور بپا ہوا' اس وقت نئی تعلیم کی علم بردار قومیں مسلمانوں کو سیاسی سٹیج سے پیچھے دھکیل چکی تھیں اور وہ خود اپنے ہی وطن میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس صورت حال پر مسلم دانش ور اور علماء مضطرب اور بے چین تھے۔ چنانچہ انہوں نے نئے افکار کو قبول کرنے یا انہیں نصاب کا حصہ بنانے کے لیے توقف سے کام لیا اور قدیم ورثے کے بچاؤ کے لیے اپنے موقف کو درست تصور کیا' بے شبہ یہ موقف احساس شکست کا نتیجہ تھا' لیکن اسے یکم قلم بودا اور بے بنیاد تصور کرنا بھی صحیح نہ ہو گا' البتہ یہ کہنا درست ہو گا کہ جب نئی تہذیب و تمدن کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور مسلمان حیرت و استعجاب کی فضا سے باہر نکل آئے تھے' اس وقت ہماری قدیم درس گاہوں کا وقت کی علمی ترقیوں سے تجاہل یا تغافل برتنا اور ان کی روشنی میں اپنے نصاب پر نظر ثانی نہ کرنا یقیناً صائب فیصلہ نہ تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ عربی زبان کی تدریس اور مذہبی تعلیم سے متعلق علمائے ازہر اور ارباب دیوبند کے نقطہ نظر میں اتحاد پایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب شیخ محمد عبدہ نے ازہر کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا' تو انہوں نے لسانی' مذہبی اور سیاسی اصلاح کی آواز اٹھائی' شیخ رائج الوقت نصاب تعلیم میں عہد انحطاط کی کتابوں کی بجائے کلاسیکی تحریروں کو شامل کرنے کے حق میں تھے۔ شیخ نے

دراصل ازہر کے پورے تعلیمی نظام کو بدلنے کی کوشش کی جس پر انہیں علمائے جامد کی تند و تلخ تنقیدات کا نشانہ بننا پڑا' حتیٰ کہ ازہر کی مجلس اعلیٰ کی رکنیت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا' لیکن انہیں اپنے اصلاحی پروگرام کی کامیابی کا اس حد تک یقین تھا کہ انھوں نے ازہر چھوڑتے وقت کہا:

"علمائے ازہر اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ازہر سے نکلنے کے بعد میں نے ازہر کے مرغزاروں کو ان کے سفلی اغراض کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جہاں چاہیں گھاس کھائیں' لیکن ایسا نہیں ہے' میں نے ان کے "خرمن" میں ایک چنگاری رکھ دی ہے' جو آج نہ سہی' کل سہی' کل نہ سہی تو آئندہ بیس تیس برسوں میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھے گی۔"(۱۰)

شیخ کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی' ان کے حریفوں کو بالاخر اپنی ہار ماننا پڑی اور وقت نے شیخ عبدہ کو جدید مسلم دنیا کا مصلح تسلیم کر لیا۔ اگر دارالعلوم کے حلقوں سے بھی کوئی محمد عبدہ اٹھ کھڑا ہوتا تو آج برصغیر میں مسلمانوں کی فکری زندگی زیادہ صحت مند ہوتی اور ہمارے مذہبی افکار و تصورات میں اور شرعی احکام کی تعبیر و تشریح اور تنقید میں وہ ژولیدگی اور انتشار نہ ہوتا جس کا مشاہدہ ہم ادہر پچاس سال سے پاکستان میں کر رہے ہیں۔ اس فکری ژولیدگی کا ایک بڑا سبب ہمارا نصاب تعلیم ہے' جو ابھی تک قرآن اور حامل قرآن کی روح کی بجائے قرون وسطی کے اشعری اور یونانی فکر کے زیر اثر ہے' جس کی وجہ سے ہم زندگی کے حقائق کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے سے قاصر ہیں اور روح عصر کا ساتھ دینے سے عاجز' جس کے نتیجہ میں ہماری اجتماعی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے اور ہم اپنے فکری اور اجتماعی بحران پر قابو پا کر دنیا کے سامنے کوئی قابل تقلید نمونہ پیش نہیں کر سکے' شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اس تلخ

حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مسلمان ایشیا کی سیاست کو ترقی دینے میں کسی قسم کا کوئی کردار ادا کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔" (۱۱) اقبال نے اسی قسم کا ایک تاریخی تبصرہ ہماری فلسفیانہ میراث کے بارے میں بھی کیا تھا' جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے' ان تبصروں کے ذکر سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اپنے طرز فکر کا گہری نظر سے جائزہ لینا چاہیے کہ کیا وہ تخلیقی ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ ہمارے تعلیمی نظام کی روح دراصل یہی طرز فکر ہے۔ چنانچہ اگر دارالعلوم کا فکر اپنے تعلیمی پہلو میں بھی حرکت پذیر ہوتا' تو اسے مسلمانوں کے فکری رجحانات اور عملی مسائل کا ادراک کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی' نیز وہ وقت کی علمی زبان میں بات کر کے اپنے افکار کو بہتر طور پر مسلمانوں کے قلب و نظر میں اتار سکتا تھا۔ مزید یہ کہ اس کا شعبہ تالیف و تصنیف مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا جو ہمارے فکری انتشار کو دور کرنے میں ایک موثر کردار ادا کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم اپنے مقدس مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے معاصر غیر مسلم مذہبی اداروں کے طریق کار سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کنیسا کی نگرانی میں کام کرنے والے متعدد ادارے اپنے اپنے علاقوں میں جن میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں' دوسرے مذاہب کے اہل علم سے مل کر مذاکرات کرتے ہیں اور اپنے کام کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور خود کنیسا اپنے ہی علماء کی تحریروں کا جن میں ترقی پسند افکار اور اصطلاحات کو جذب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علمی محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ آج کل لاطینی امریکہ میں علماء کی ایک جماعت استبدادی حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک آزادی کا ساتھ دے رہی ہے اور اپنی تحریروں میں ان تمام اصطلاحات کا استعمال کر رہی ہے' جنہیں مارکسی اہل قلم استحصالی طاقتوں سے برسرپیکار محنت کشوں کی جدوجہد کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ ان علماء نے کہا ہے کہ مذہبی نقطہ نظر سے عوام کو بے

رحم سرمایہ داروں کی اقتصادی اور معاشی غلامی سے نجات دلانا ضروری ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مزدوروں کی تاریخی جدوجہد کا ساتھ دینا لازمی ہے۔ علماء نے اپنی تحریروں کو دینیاتی حریت (Theology of Liberation) کا نام دیا ہے' لیکن ان تحریروں پر کنیسا نے تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ بے شبہ حضرت مسیحؑ کا پیغام آزادی کا پیغام ہے۔ لیکن یہ آزادی دراصل گناہ کی غلامی سے جو غلامی کی بدترین شکل ہے' رہائی کا نام ہے۔ ہرچند اقتصادی اور معاشی غلامی سے آزادی مسیحی تصور حریت کے وسیع مفہوم میں داخل ہے' لیکن بائبل کا تصور حریت ایک ماورائی (Transcendental) تصور ہے' اس کا صرف معاشی یا سیاسی آزادی پر اطلاق دراصل آسمانی انجیل کو "زمینی انجیل" کی پست سطح پر اتارنا ہے۔ اس تنقید میں مزید کہا گیا کہ معاشی آزادی سے متعلق مارکسی اصطلاحات کو ان کے سیاق و سباق سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے' یہ کہنا کہ ہم صرف غریبوں کی معاشی فلاح کے لیے مارکسی تحریکوں کا ساتھ دے رہے ہیں' درست نہیں ہے' کیوں کہ ان اصطلاحات سے وابستہ فلسفے کو تحریک سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کنیسا نے اپنی تنقید میں اس بات پر زور دیا کہ غریبوں کی اقتصادی آزادی کے لیے کام کرنا عیسائیت کے دل کی آواز ہے' لیکن اس آزادی کا بنیادی سرچشمہ انسانی ارادہ نہیں' خدا کی ذات ہے۔(۱۲) الغرض کنیسا نے اپنے ہی علماء کی تحریروں پر تنقید کی' جس کے وزن و وقار کا اندازہ اہل نظر ہی لگا سکتے ہیں' آزادی کا یہ لطیف اور اخلاقی تصور تمام عالمی مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۳۵) میں آیا ہے کہ حضرت مریمؑ کی ماں نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اسے خدا کی نذر کر کے آزاد ("محررا") کر دیں گی' اس نذر کو انہوں نے آزادی (محررا") کا نام دیا ہے' گویا خدا کی بندگی انسان کو دنیا اور اہل دنیا کی غلامی سے

نجات دلاتی ہے' اس آزادی میں ارباب معرفت نے ہوا و ہوس کی غلامی سے رہائی کو سرفہرست رکھا ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ عربی ادب میں گناہ کی آلائشوں اور پست اخلاق سے دوری صحیح معنی میں آزادی ہے۔ یہ تصور مکہ کے مشرک معاشرے میں بھی کسی حد تک پایا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندہ اور دوسری عورتوں سے بہ وقت بیعت چند برائیوں سے بچنے کا عہد لیا' تو ان برائیوں کی فہرست میں زنا بھی شامل تھا' اس پر ہندہ نے حیرت سے کہا تھا: "کیا کوئی آزاد خاتون یہ "کام" کر سکتی ہے۔" (اوتزنی الحرة) غرضیکہ حریت اسلام میں زندگی کی بنیادی قدر شمار ہوتی ہے (الاصل فی الناس الحریة)' علمائے دیوبند' جنہوں نے جذبہ حریت سے سرشار ہو کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں' اپنے معاصر غیر مسلم علمی اداروں سے باخبر ہو کر اپنے نصب العین کو بہتر طور پر مسلمانوں اور دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور اپنے علم کلام میں "عہد حاضر میں مسلمانوں کی فکری تاریخ" جیسے اہم موضوعات پر لکھ کر مسلم دانشوروں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ الغرض دارالعلوم نے بعض علمی پہلوؤں میں روح عصر کا ساتھ دینے میں اب تک جو پہلوتہی کی ہے' اس کی بنیادی وجہ یہی وہ طرز فکر ہے' جو سیاست میں تو متحرک واقع ہوا ہے' لیکن فقہ' کلام اور تعلیم میں سکون پسند' شاید یہی وجہ ہے کہ پروفیسر سمتھ نے جو برصغیر کی مسلم تحریکوں پر بقول ڈاکٹر ذاکر حسین گہری نظر رکھتے ہیں(۱۴) "تحریک دیوبند کو ہرچند کہ وہ بورژوائی سوسائٹی اور اس کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف اپنی مستقل دشمنی کی وجہ سے وقتی طور پر ترقی پسند طاقتوں کی ایک اہم حلیف جماعت بن چکی ہے" بنیادی طور پر رجعت اور قدامت پسند قرار دیا ہے"۔(۱۵)

اگر دارالعلوم ایک غیر معروف ادارہ ہوتا تو اس کا یہ موقف شاید قابل التفات نہ ہوتا' لیکن دارالعلوم کو اس کی دینی خدمات کی وجہ سے برصغیر کی قومی زندگی میں

جائز طور پر ایک بلند مقام حاصل ہے، جس کی وجہ سے اس کی علمی سرگرمیاں نقد و تبصرہ کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتیں، چنانچہ جہاں ہم نے گزشتہ صفحات میں اس کی روحانی اور اخلاقی خدمات کا اعتراف کر کے تاریخی حقائق کو تسلیم کیا ہے، وہاں اس کے تعلیمی نظام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم کو جدید ہندوستان میں اپنی علمی زندگی اور اس کے طریق کار کا محاسبہ کرنا چاہیے کیوں کہ اب اجتماعی زندگی کے تقاضوں کی نوعیت برطانوی ہندوستان کی زندگی سے مختلف ہے اب اگر کسی آدمی نے انفرادی طور پر وقت کی برق رفتاری کا ساتھ دینے میں سستی سے کام لیا، تو وہ قابل معافی ہے، لیکن عرصہ حیات میں سرگرم عمل قوموں کی سست روی بقول طٰہٰ حسین ناقابل برداشت ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے قدم ایک منزل پر جا کر رک نہ جائیں، بلکہ ایک نئی منزل کی تخلیق کر کے اس کی طرف بڑھیں، نئی نئی منزلوں کی تخلیق کر کے ان کی طرف بڑھتے رہنے ہی میں قوموں کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔(۱۵) واقعہ یہ ہے کہ وقت نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ان میں اور ان کے ہندو ہم وطنوں میں بہ وجوہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پائی جاتی ہیں، مزید یہ کہ مسلمان اجتماعی زندگی میں ایک نئے سیاسی تجربے سے گزر رہے ہین، اب تک وہ ہندوستان میں صدیوں سے حاکم تھے یا محکوم لیکن بیسویں صدی میں جدید سیاسی تصورات نے انہیں اور انکے ہندو ہم وطنوں کو ایک نئے سیکولر جمہوری نظام کے قیام کے لیے مجبور کر دیا ہے، اس نئے سیاسی نظام میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو اور اس نظام کا دعویٰ ہے کہ وہ ملک کے ہر شہری کے قانونی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق کے تحفظ کا ضامن ہے۔ کیا مسلمانوں کو اس نئے سیاسی تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے قومی زندگی میں سعی

و عمل سے کام لینا چاہیے؟ ارباب دیوبند کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سیاسی تجربے کی کامیابی کے لیے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے' لیکن مسلمان یہ کردار کیوں کر ادا کریں؟ کیوں کہ اس کردار کو ادا کرنے کے لیے انہیں سب سے پہلے علمی' اخلاقی اور معاشی مسائل پر قابو پانا ہو گا اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر اپنی اجتماعی خودی کو مجروح کئے بغیر اتحاد و تعاون کی نئی نئی راہوں کو تلاش کرنا ہو گا۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کیا دارالعلوم مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے گا؟ اس سوال کا صحیح جواب تو مستقبل ہی کے پاس ہے' البتہ برطانوی ہندوستان میں ارباب دیوبند نے اپنی مذہبی اور اجتماعی زندگی میں خدا ترسی' حق گوئی اور جان فروشی کی جو روایات قائم کی ہیں ان کے پیش نظر دارالعلوم سے یہ امید رکھنا بے جانہ ہو گا کہ وہ آزاد ہندوستان میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے' البتہ بدلے ہوئے حالات اور نئی ذمہ داریوں کا فطری تقاضا ہے کہ دارالعلوم اپنے معاشرے اور مسلمانوں کے فکری اور عملی مسائل سے آگاہ ہو اور اپنے تعلیمی نظام اور علمی زندگی کا ناقدانہ جائزہ لینے کے لیے تیار۔ افلاطون نے کہا تھا کہ تنقید سے خالی زندگی' زندگی نہیں۔

(The Uncriticized life is not worth living)

ارباب دیوبند سے زیادہ کون اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے آدمی کو کٹھن ریاضتوں اور قطرہ کو گہر بننے تک کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے' یہی حال نظام تعلیم و تربیت کا ہے جو محاسبہ و مراقبہ کی منزلوں سے گزر کر ہی ارتقاء و کمال کے مقام تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ اپنے نظام تعلیم و تربیت پر نظر ثانی اور روح عصر کا ساتھ دیے بغیر وہ سوسائٹی میں ایک مثبت اور صحت مند کردار ادا نہیں کر سکتا۔ یہ بات پاکستان کے خالص دینی اداروں کے بارے میں

بھی۔ خواہ ان کا کسی بھی مکتب فکر سے تعلق ہو۔ کہی جاسکتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے علمائے دیوبند کی فکر و نظر کے سامنے ادراک حقیقت کی نئی نئی راہوں کو کھول دے گا بشرطیکہ وہ زندگی اور علم کے بارے میں ایک متحرک نقطہ نظر کو اپنا کر ایک نئے عزم اور حوصلے سے آگے بڑھے۔ "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" (۲۹: ۶۹)

# ماخذ و حواشی

۱۔ مولانا مدنیؒ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار حضرت شیخ اجمیریؒ کا تذکرہ کیا ہے' جن کا مقصد یہ ہے کہ مولانا اہل ہند کو اسلام کے نام سے امن و آشتی اور محبت و اخوت کا پیغام دینا چاہتے ہیں' اسلام کی یہی وہ تعبیر ہے جس کو عام کرنے کیلئے صوفیا اور اہل حق سرگرم عمل رہے ہیں۔

۲۔ محمد انوارالحسن شیرکوٹی: انوار عثمانی (مکتوبات)' کراچی ۷۵' (ط۔ مکتبہ اسلامیہ)

۳۔ ہمیں یہاں اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کہ پاکستان میں مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دینے میں بعض دیوبندی اہلسنّت حضرات کا بھی حصہ ہے' لیکن ان حضرات کا یہ شغل (مجادلہ و مناظرہ) علمائے حق کے بلند اخلاقی اور روحانی مسلک سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ٹھیک ہے کہ مولانا محمود حسنؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنے شباب میں مجبوراً" اختلافی مسائل پر لکھا' لیکن وہ بہت جلد ان "مقامات" سے آگے نکل گئے اور اپنے آپ کو اسلام اور انسانیت کی بلند قدروں کی اشاعت و تبلیغ کے لیے یک قلم وقف کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے علمائے دیوبند کی مذہبی خدمات کے تذکرہ میں دیوبندی' بریلوی یا دیوبندی' اہل حدیث یا سنی' شیعہ کے فروعی مذہبی اختلافات کے ذکر سے اجتناب کیا ہے۔ کیوں یہ ساری جماعتیں اسلام کے بنیادی عقائد

پر ایمان رکھتی ہیں۔

۴۔ محمد میاں: جمعیت العلماء کیا ہے؟ دہلی ۱۹۴۲ء، ۲/۴۴، بحوالہ جمعیت العلماء، ج ۱، ص ۲۰

۵۔ انصاری: عبدالعلیم، تذکرہ رحمانیہ، پانی پت، ۱۹۳۸ء، ص ۲۰۷

۶۔ تقریریں، تحریریں اور بیانات (انگریزی) لاہور، ص ۴۴

The future of Islam in India largely depends in my opinion on the freedom of Muslim peasants in the Punjab.

۷۔ یہ الفاظ مرحوم چوہدری افضل حق نے احرار کانفرنس (قصور ۱۹۴۱ء) کو خطاب کرتے ہوئے کہے۔ دیکھیے شورش کاشمیری: احرار، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۹۹

۸۔ افضل حق: تاریخ احرار، لاہور، ص ۱۱۰، (ط۔ زمزم بک ایجنسی)

۹۔ ص ۶۳۔ ۸۳ ۔ ڈاکٹر فضل الرحمان (وفات ۱۹۸۸ء) کے فکر اور اظہار فکر میں بڑی صفائی تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصر اہل علم سے ممتاز تھے۔ موصوف شکاگو یونیورسٹی میں اسلامی فکر کے پروفیسر تھے اور جمعہ کے دن خطبہ دیا کرتے، جس میں امت کی موجودہ مشکلات اور مسائل کا اختصار سے تجزیہ کرتے تھے۔ ان کی تالیفات میں سے، جن سے انہوں نے راقم کو نوازا تھا، ایک نفیس کتاب " قرآن کے بنیادی افکار" کو پڑھ کر راقم نے ان سے کہا کہ وہ اسی طرز پر رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ اور اسلام میں تصور ریاست پر بھی لکھیں، موصوف نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ راقم اپنے قیام شکاگو میں ان سے برابر ملتا رہا اور ان کی علمی گفتگو، لطائف اور ان کے لطف و کرم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ چنانچہ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ مسلم دنیا کو موصوف جیسے وسیع النظر، صاحب فکر اور

منکسر المزاج عالم اور سکالر کو دیکھنے کے لیے بہت دنوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔ موصوف کے والد مولوی شہاب الدین، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے، موصوف نے عربی زبان اپنے والد مرحوم سے پڑھی، جدید علوم سے آشنائی خود پیدا کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں گب جیسے معروف پروفیسر سے تلمذ حاصل کیا اور یوں دیوبند کے وجدان اور آکسفورڈ کے فکر کو اپنی ذات میں سمویا، جس سے ان کی علمی شخصیت کا چہرہ دمک اٹھا، وفات سے قبل وہ اپنے بارے میں کرنیگ (K-Cragg) کی کتاب (The Pen & Faith) میں ایک مقالہ پڑھ چکے تھے۔ برصغیر کے علماء میں سے مرحوم مولانا محمد یوسف بنوری، ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ مولانا مرحوم نے راقم سے اپنی ایک ملاقات میں ڈاکٹر موصوف کے علم، صبر و تحمل کا تفصیلی تذکرہ کیا تھا۔ الغرض ڈاکٹر صاحب نے ایک انسان اور سکالر کی حیثیت سے دوسروں کو متاثر کیا، جامعہ شکاگو میں طالب علموں نے ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔ آج ان کی کتابوں کے ترجمے ترکی، مالوی، انڈونیشی اور مشرقی یوروپ کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مکروہات دنیا سے نجات ملی تو موصوف کی شخصیت اور ان کے افکار پر مقالہ سپرد قلم کرنے کی تمنا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کی علمی خدمات کو قبول فرمائے۔

۱۰۔ طہ حسین: ھذا مذہبی، قاہرہ، ۱۹۵۵ء، ص ۷ ۱۹۴ء، (علی عبدالرازق کا مضمون: "تحریر الفکر و فہم الدین للشیخ محمد عبدہ)

۱۱۔ تقریریں، تحریریں اور بیانات ص ۱۲۰۔

Consequently (They) failed to do anything for the political improvement of Asia.

۱۲۔ "دینیاتی حریت کے بعض پہلوؤں پر ہدایت، سینٹ پول ایڈیشن،

بوسٹن، امریکہ، ص ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۲۳ نیز ملاحظہ ہو روزنامہ " ڈان" کراچی، ۲۴۔ اگست ۱۹۸۴ء، ص ۴، (جان ڈی انیس (Onis De) کا مضمون:۔ دینیاتی حریت پروٹیکان کا حملہ"۔ واقعہ یہ ہے کہ عیسائی مشنریوں نے برصغیر میں جس محنت، لگن، منصوبہ بندی اور تنظیم سے کام کیا ہے، مسلمانوں کا مذہبی حلقہ بڑی حد تک اس سے بے خبر ہے۔ ان عیسائی تنظیموں نے صدیوں سے پٹی ہوئی ایک انسانی جماعت۔ جسے ہم ازراہ حقارت چمار اور بھنگی سے یاد کرتے ہیں۔ مجروح وقار اور شعور کو بحال کرنے میں جو تاریخی کردار ادا کیا ہے، اس پر خدا اور انسانیت سے محبت کرنے والی جماعتیں فخر کرسکتی ہیں۔ ہماری تمنا تھی کہ پاکستان میں یہ سعادت مسلمانوں کی مذہبی جماعت کے حصہ میں بھی آجاتی، لیکن یہ جماعت سطحی سیاست اور خوفناک مذہبی فرقہ واریت میں ایسی الجھ گئی ہے کہ اس پر اہل نظر محو حیرت ہیں۔

۱۳۔ پروفیسر سمتھ (W ـ C) عہد جدید کی مسلم تاریخ اور فلسفہ مذہب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب "اسلام در عہد جدید" میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر بھی لکھا ہے، جس پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا کہ آپ نے (سمتھ) جس دقت نظر سے ہمارے مسائل پر لکھا ہے، ایسا تو شاید خود ہندوستانی مسلمان بھی نہ لکھ سکیں، ہارورڈ کے قیام میں راقم ان سے اکثر ملتا رہا۔ ملاقات سے قبل انہوں نے راقم کو متعدد خط لکھے تھے، جن میں ایک خط سقوط بیت المقدس (۱۹۶۷ء) سے متعلق تھا، جس میں انہوں نے اس المیہ پر اپنے رنج و الم کا ذکر کیا تھا۔ راقم نے ان کی شخصیت کو اہل علم کی خوبیوں۔ اخلاص، علم، اہل علم اور سچائی سے لگاؤ، ذمہ داری کا گہرا احساس۔ کا خوب صورت مرقع پایا۔ آج کل وہ عالمی مذاہب کے

ماننے والوں کے درمیان افہام و تفہیم کی راہوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

۱۴۔ جدید اسلام در ہند' ص ۳۶۴۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کی تالیف کے وقت پروفیسر موصوف اشتراکیت سے متاثر تھے' شاید یہی وجہ ہے کہ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "تلاش ہند" میں اس کتاب اور فاضل مولف کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے ملک کے معروف دانشور مرحوم ڈاکٹر محمد اجمل کا کہنا ہے کہ پروفیسر موصوف اب اس کتاب سے لاتعلق ہو چکے ہیں' افسوس! ہم اپنی ملاقاتوں میں پروفیسر سے لاتعلقی کی وجہ نہ پوچھ سکے۔ البتہ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں لاہور کی ایک نشست میں اشتراکیت سے اپنی مایوسی کے اسباب ضرور بیان کئے تھے۔ مدرسہ دیوبند کے بارے میں پروفیسر لکھتے ہیں:

"The deoband movement is essentially reactionary and feudal. Yet its implacable enmity to bourgeois society and to its depredations has made it a temporary and important ally of the progressive forces."

۱۵۔ محمود عثمان: طہٰ حسین ودیمقراطیۃ التعلیم' قاہرہ' ص ۱۱۲' ۱۱۳